تنقید و تبصرہ

ملفوظات مولانا احمد علی رحمتہ اللہ علیہ

ایک زمانے میں لاہور شہر کی پرانی آبادی کے ارد گرد کی ساری زمینیں مسلمانوں کی ملکیت
تھیں۔ پھر کاریگر اور دستکار طبقہ بھی زیادہ تر مسلمان تھا، گویا اس دور میں لاہور کے
مسلمان مجموعی طور سے صاحب جائیداد بھی تھے اور بامروزگار و خوشحال بھی۔ لیکن برطانوی
اقتدار کے بعد جب نئی قسم کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ غیر مسلم طبقوں نے اس میں سبقت کی
اس کے ساتھ ساتھ سماجی احوال و ظروف بھی بدلے۔ اور ایک نیا معاشی نظام جنم لینے لگا
تو مسلمانوں کے قدم زندگی کی دوڑ میں غیر مسلموں کے مقابلے میں سست پڑنے لگے چنانچہ
جیسے جیسے غیر مسلم آگے بڑھتے گئے مسلمان پیچھے ہوتے گئے۔

اس پر مستزاد یہ کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں بعض اور عمرانیاں بھی زور پکڑ گئیں
انفرادی بے راہ رویوں اور بداخلاقیوں کے علاوہ ان میں اجتماعی طور پر بے شمار مسرفانہ
رسمیں عام ہو گئی تھیں۔ ان میں بعض تو برادری میں اپنی شان قائم رکھنے کے لئے اور بعض
مذہبی اثرات کے تحت لی جاتی تھیں جن کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان زمینیں اور مکان بیچ کر
اور انہیں گرو رکھ کر یہ رسمیں سرانجام دیتے تھے، اور اس طرح ان کا صاحب جائداد
اور کاریگر طبقہ تلاش ہوتا جا رہا تھا۔ شادی و بیاہ کے معاملات میں برادری میں
ناک نہ کٹے، اور میت کی روٹی، فاتحہ اور اس سے متعلقہ دوسری رسموں میں مروجہ
مذہب کی روایات کی خلاف ورزی نہ ہو، یہ بات اتنی اہم سمجھی جاتی تھی کہ مسلمان اپنی آخری
پونجی تک ان مسرفانہ رسوم میں خرچ کرنے سے گریز نہ کرتے، اور جن کے پاس کچھ نہ ہوتا
وہ زیادہ سے زیادہ شرح سود پر قرض لینے پر مجبور ہو جاتے۔

اس میں شک نہیں کہ لاہور کے مسلمانوں کے بعض حلقوں میں اس دور میں انگریزی

تعلیم حاصل کرنے کا رواج شروع ہوگیا تھا، لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ جو مسلمان نوجوان انگریزی کالجوں سے فارغ التحصیل ہوتے، وہ مسلمانوں کے راسخ العقیدہ گروہ سے نکل کر نئے مذہبی فرقوں سے وابستگی کو ترجیح دیتے۔

کم و بیش اسلامی لاہور کا یہ مذہبی سماجی معاشی اور ذہنی پس منظر تھا جب غالباً پہلی جنگ عظیم کے دوران مولانا احمد علی مرحوم کو خود ان کے الفاظ میں دہلی سے ہتھکڑیاں لگا کر لاہور لایا گیا اور یہاں انہیں یہ موقع ملا کہ وہ شیرانوالہ دروازہ کے باہر ایک ایسی مسجد میں جہاں "دن کو گیدڑ جوتیاں اٹھا کر لے جاتے تھے"۔ قرآن مجید کا درس شروع کریں۔ قرآن مجید کا درس ہر عالم دین دیتا ہے، لیکن مولانا مرحوم کے درس قرآن کے عملی مضمرات کچھ اور تھے چنانچہ اس کی وجہ سے جہاں ایک طرف انگریز انہیں اپنا دشمن سمجھتا رہا، وہاں دوسری طرف ابتدا میں ان عوام نے بھی آپ کی مخالفت کی جو بلے سمجھی سے مسرفانہ رسوم کو جزو مذہب مانتے تھے۔ مولانا مرحوم نے اپنے شروع کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا۔

"اب تو محلہ والے ٹھیک ہوگئے ہیں، لیکن ابتدا میں انہوں نے مجھے بڑا ستایا ایک دفعہ تنگ آکر میں نے ان سے کہا کہ میں قرآن مجید ہاتھ میں لے بیٹا ہوں۔ تم مجھے دھکے دیکر مسجد سے نکال دو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ یہ جرأت ان کو نہ ہوئی"

حضرت مولانا احمد علیؒ کا ۱۳۸۱ھ میں انتقال ہوا، گویا تقریباً چوالیس پینتالیس سال تک لاہور اور خاص طور سے شیرانوالہ دروازہ ان کی جملہ سرگرمیوں کا مرکز رہا جن کے عملی نتائج آج سب لوگوں کے سامنے ہیں۔

مولانا کے درس قرآن کی برکت سے لاہور اور لاہور سے باہر بھی انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کا ایک اچھا خاصا طبقہ موجود ہے، جو اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ دین سے پورا شغف رکھتا ہے، پوری طرح راسخ العقیدہ ہے اور اپنے اپنے دائرے میں حسب حیثیت دینی و ملی خدمات سرانجام دے رہا ہے

مسرفانہ رسوم کی اصلاح کے سلسلے میں مولانا مرحوم کو جو کامیابی ہوئی راقم الحروف اس سے ایک حد تک خود شخصی طور سے واقف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے درس قرآن، جمعہ کے خطبوں اور دعظ و تلقین نے ہزاروں خاندانوں کو معاشی تباہی سے بچا لیا۔ اور ان میں سے بہت سے ایسے خوش نصیب بھی ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ

نے اپنی رحمت سے بہت نوازا، اور انہوں نے بھی مولانا کے اصلاحی کاموں میں دل کھول کر مدد کی۔ بس ان کا اشارہ ہوتا، اور ہزاروں روپیہ ان کے قدموں میں پہنچ جاتا۔ صرف ایک واقعہ ملاحظہ ہو، مولانا فرماتے ہیں۔

ایک دفعہ شام کے وقت میں لیٹا ہوا تھا کہ دو شخص آئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ ہمیں بھی کوئی دین کی خدمت کا کام بتلایئے۔ میں نے کہا یہ قرآن مجید چھپوانا ہے۔ میرے دوست کے حساب کے مطابق ۴۵ ہزار روپیہ لگتا ہے....

ابھی آٹھ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ پچاس ہزار روپیہ دونوں کی طرف سے آگیا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نہ انہیں جانتا تھا اور نہ ہی پہچانتا تھا، نہ معلوم کون تھے۔

ان دینی، اصلاحی، تعلیمی اور علمی کاموں کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم ہر اسلامی عوامی تحریک میں بھی پیش پیش رہے، چنانچہ اس طویل مدت میں اہل لاہور نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ وہ ان کے کسی عوامی مطالبے میں ان کے بجائے حکومت وقت کے ساتھ ہوں، اس لئے آپ کو کئی بار جیل جانا پڑا۔ اور وہ بڑی خوشی سے جیل گئے۔

غرض مولانا کی ذات گرامی اور ان کا شیرانوالہ دروازہ کا دینی، اصلاحی علمی اور تعلیمی مرکز ایک اخلاقی پاور ہاؤس تھا۔ جس کی "کرنٹ" ان تمام سالوں میں دور دور تک پہنچتی رہی، اور اس سے ان دیار کے عوام و خواص کے ایک بڑے حصے کو نئی زندگی ملی۔

زیر نظر کتاب میں اس بابرکت شخصیت کے ملفوظات کو جناب محمد عثمان غنی بی اے نے مرتب کیا ہے۔ ایک باب میں "خطبات جمعہ کے اقتباسات" ہیں۔ دوسرا باب مشتمل ہے "مجالس ذکر کے چیدہ چیدہ فقرات" پر تیسرے باب میں "نصیحت آموز واقعات" ہیں۔ باب چہارم میں وہ اشعار ہیں، جو مولانا مرحوم وقتاً فوقتاً پڑھا کرتے ہیں "خطبات جمعہ کے اقتباسات" میں بعض ایسے اقتباسات ہیں جو سراسر وقتی حیثیت رکھتے ہیں اور انکا اس مجموعہ میں ہونا کچھ اچھا نہیں لگتا، خاص طور سے وہ جن میں چند بیگم، دولتانہ اور ناظم الدین سے خطاب ہے۔ بالجملہ اس مجموعہ میں بڑی اثر کرنے والی باتیں ہیں۔ اور اس کا مطالعہ ایک دینی و اخلاقی نعمت ہے۔ ان ملفوظات میں پند و موعظت ہے۔ خدا اس کے رسول اور بزرگوں کے ارشادات ہیں۔ بری عادتوں اور غیر شرعی رسموں کی مذمت ہے اور راہ راست پر چلنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

مثال کے طور پر چند الفاظ میں قرآن کا خلاصہ بتاتے ہیں :۔ " اللہ کو عبادت سے، رسول کو اطاعت سے، مخلوق کو خدمت سے راضی رکھو۔" ایک اور ارشاد گرامی ہے:۔ "ماں باپ کو ستانے والوں کو نہ نماز اور نہ روزہ جہنم سے بچائے گا۔ نہ زکوٰۃ اور نہ ڈبل حج۔ ان کے لئے میں دوزخ کا فتویٰ دے رہا ہوں۔" فرماتے ہیں :۔ "سب کچھ بننا ہے آسان، سب سے مشکل بننا ہے انسان۔ انسان بناتا ہے قرآن"

حضرت مولانا کے روحانی بزرگ پہلے حضرت دین پوریؒ اور بعد میں حضرت امروٹی صاحب رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ اور استاد مولانا سندھیؒ تھے فرماتے ہیں :۔ "مجھے استاد مولانا سندھی ملے اور شیخ حضرت امروٹی۔ ان حضرات کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے اشاعت قرآن کی توفیق دی۔"

مولانا مرحوم عالم دین بھی تھے، اور صاحب طریقت صوفی بھی۔ آپ کا ایک ارشاد ہے :۔ "قال کے مربی علمائے کرام اور حال کے مربی صوفیائے عظام ہیں۔ عالم پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا، جب تک قال حال نہ ہو جائے۔" خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں "۔ میں فقہ میں حضرت امام اعظمؒ اور طریقت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا متبع ہوں۔ گویا کہ میں حنفی بھی ہوں اور قادری بھی ہوں۔" آپ تصوف کو بدعت کہنے والوں کو بے سمجھ قرار دیتے تھے۔ اور اہل اللہ کی صحبت تزکیہ نفس کے لئے ضروری مانتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے "قال کے بعد حال کے لئے صاحب حال کی صحبت کی ضرورت ہے۔" نیز "صحبت کے بغیر نہ ہستی مرتی ہے اور نہ دنیا پرستی کی بیماری جاتی ہے..."

مولانا مرحوم بحیثیت عالم کے تعلیم دین بھی دیتے، بحیثیت ایک مصلح و مرشد کے بری عادتیں اور غیر شرعی رسمیں بھی چھڑاتے اور بحیثیت ایک صاحب حال بزرگ کے اپنے فیض صحبت سے تزکیہ نفس بھی فرماتے تھے مرحوم کی ذات ان سب حیثیات کی جامع تھی۔ اب اگر ان کی صرف "صاحب حال" حیثیت پر زیادہ زور دیا گیا، جیسا کہ ان سے انتساب رکھنے والے بعض حلقوں میں دیا جا رہا ہے۔ اور ان کی شخصیت کے ارد گرد کرامات اور ما فوق العقل روایات کا تانا بانا بن دیا گیا، تو چند سالوں کے بعد دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی ذات بھی محض ایک روحانی افسانہ سا بن جائے گی، اور بعد کی نسلوں کے لئے یہ جاننا مشکل ہو جائے گا کہ ان کی صحیح شخصیت کیا تھی۔ اور چالیس پچالیس سال تک اس سرزمین میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی کتنی بڑی خدمت کی۔

بے شک تصوف میں اپنے مرشد سے حددرجہ عقیدت رکھنا عملاً ضروری ہوتا ہے۔ اور سلکِ "توحید فی الشیخ" کے تحت اسے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کا واسطہ بنانا فطری ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس معاملے میں توازن لازمی ہے، ورنہ اگر غلوئے عقیدت نے تخیل کو اس طرح بے عنان رکھا، تو جس مقصدِ عظیم کے لئے حضرت مولانا چالیس بیالیس سال تک سرگرم کار رہے، ہمیں یہ ڈر ہے، ان کی ذات سے اس طرح کرامات کے منسوب کرنے سے وہی مقصد فوت ہو جائیگا۔

زیر نظر کتاب مجلد ہے، ۲۲۴ صفحات ہیں، اور ہدیہ تین روپے۔

ملنے کا پتہ :- دفتر انجمن خدام الدین۔ اندرون دروازہ شیرانوالہ، لاہور ۵

(ا - س)

ہندوستان میں Development of Religious Thought in India مذہبی فکر کی ارتقاء)

تاریخ کے کسی بھی دور میں جب دو مذاہب، دو تہذیبیں یا دو قومیں شروع میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ان میں آپس میں ربط بڑھتا ہے، پھر انہیں ایک ہی جغرافیائی ماحول میں مل کر رہنا پڑتا ہے، تو اس دوران میں ان میں باہم ایک دوسرے پر غالب آنے، ایک دوسرے کو متاثر کرنے یا اس سے اثر پذیر ہونے یا ایک دوسرے کو اپنے اندر ضم کرنے کی جو مسلسل کشمکش ہوتی رہتی ہے، اس کا مطالعہ تاریخ کا ایک بڑا اہم اور دلچسپ باب ہے۔

جناب بی اے ڈار ریڈر اسلامک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور نے زیر نظر ۱۶ صفحے کے انگریزی کتابچے میں اس کشمکش پر مختصر تبصرہ کیا ہے، جو آٹھویں صدی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی افکار میں ہوتی رہی۔ ڈار صاحب کا یہ تبصرہ بڑا پراز معلومات اور فکرانگیز ہے، کیا ہی اچھا ہو، اگر اس کا اردو ترجمہ بھی ہو جائے۔

۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا۔ ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے جن کے نتیجے میں لاہور غزنوی سلطنت کا مستقل مرکز بن گیا۔ مصنف کے نزدیک اس تین سو سال کے عرصے کی اس فکری ارتقا کے اعتبار سے زیادہ اہمیت نہیں، دونوں مذاہب اور دونوں تہذیبوں میں اصل کشمکش محمود غزنوی کے بعد شروع ہوتی ہے بقول مولانا سندھی کے اس دور میں جب مسلمان ہندوستان کی طرف بڑھے ہیں، تو ان کے دانش ور طبقے بغداد